ڈارون کا نظریۂ ارتقاء۔ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر علی محمد بٹ

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے بعد انسان کی اصلیت کے بارے میں بحث ومباحثہ کا آغاز ہوگیا۔اس نظریے نے انسان کی عقلی کاوشوں کو حالتِ تذبذب میں ڈال دیا، خاص کر انسانی سماج کا وہ طبقہ، جو سائنسی علوم سے متاثر تھا، اس نے اس نظریے کو قبول کرتے ہوئے مختلف مباحث چھیڑ دیے۔بعض مسلمان بھی اس سے متاثر ہوگئے، چنانچہ اس نظریہ نے مذہبی حلقوں میں بھی بے چینی پیدا کردی۔اس طرح انسان اور دوسرے حیوانات کی تخلیق سے متعلق دوطرح کے نظریات ہوگئے: ایک یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہ حیثیت انسان ہی پیدا کیا ہے۔ قرآن اور احادیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق کی، ان ہی کی جنس سے ان کی بیوی حضرت حوّا کو پیدا کیا، پھر اس جوڑے سے بنی نوع انسان پوری دنیا میں پھیلے۔آدم علیہ السلام کا خاکہ جب اللہ تعالیٰ نے بنایا تو اس میں 'کُن' کے ذریعہ روح پھونک دی۔اسی کا اثر ہے کہ انسان میں دوسرے تمام حیوانات کے مقابلے میں عقل وشعور،قوت ارادہ واختیار اور تکلّم کی صفات پائی جاتی ہیں۔اس نظریہ کے قائل زیادہ تر الہامی مذاہب کے حاملین ہیں،تاہم بعض مغربی مفکرین نے بھی اس کی حمایت کی ہے۔

دوسرا گروہ مادہ پرستوں کا ہے، جو انسانی وجود کو خالص ارتقائی تبدیلی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔اس نظریہ کے قائلین زندگی کو ارتقائی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ان کی دلیل یہ ہے کہ زندگی اربوں سال پہلے ساحلِ سمندر سے نمودار ہوئی، پھر اس سے نباتات کی مختلف انواع ترقی کرتے کرتے حیوانات پیدا ہوئے۔انہی حیوانات سے مختلف مراحل میں ترقی کرتا ہوا انسان وجود میں آیا۔[۱]

اس ارتقائی سفر کے دوران کوئی ایسا نقطہ متعین نہیں کیا گیا اور نہ کیا جاسکتا ہے جہاں سے غیر انسانی حالت کا وجود ختم کر کے نوعِ انسانی کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ سب سے پہلے ارسطو (۳۲۲۔۳۸۴ق م) نے پیش کیا تھا۔ اس ارتقائی تبدیلی کے قائلین میں عناکسی میندر، عناکسی مینس، ایمپی ووکل اور جوہر پسند فلاسفہ قابلِ ذکر ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی سے پہلے یہ ایک گم نام نظریہ تھا۔ ۱۸۵۹ء میں سر چارلس ڈارون نے The Origin of Species by Means of Natural Selection تصنیف کی۔ اس کے بعد یہ نظریہ ایک علمی بحث میں تبدیل ہوگیا۔ اس کے ماننے والوں میں بھی کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈارون نے بندر اور انسان کو ایک ہی نوع قرار دیا، کیونکہ اس کے نزدیک حس و ادراک کے پہلو سے دونوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔۲ لیکن کچھ لوگ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور انھوں نے انسان کو بندر ہی کی اولاد قرار دیا۔ کچھ ان سے بھی آگے بڑھے تو کہا کہ تمام سفید فام انسان چیمپینزی سے، سیاہ فام انسان گوریلا سے اور لمبے سرخ ہاتھوں والے انسان تگنان بندر سے پیدا ہوئے ہیں۔ مورخین نے تو ان مختلف رنگ کے انسانوں کو سیدنا نوح علیہ السلام کے بیٹوں حام، سام اور یافث کی اولاد قرار دیا تھا، مگر یہ حضرات انہیں چیمپینزی، گوریلا اور تگنان کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ ۳ بعض مفکرین اس بات کے قائل ہیں کہ انسان بندر کی اولاد نہیں، بلکہ بندر کو انسان سے پیدا کیا گیا ہے۔ ان کا تصور ہے کہ انسان کو کچھ قدرتی تبدیلیوں کی وجہ سے بندر کی شکل دے دی گئی۔

جدید سائنس دانوں کا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ تخلیقِ انسان سے متعلق نظریۂ آفت گیری ہے، جس کا بانی کوپیر (۱۷۹۶۔۱۸۳۲ئ) ہے، جو فرانس کا باشندہ اور تشریح الاعضاء کا ماہر تھا۔ اس کے مطابق تمام اقسام کے تابع علیٰحدہ علیٰحدہ طور پر تخلیق ہوئے۔ یہ ارضی و سماوی آفات میں مبتلا ہوکر نیست و نابود ہو گئے، پھر کچھ اور حیوانات پیدا ہوئے۔ یہ بھی کچھ عرصہ بعد فنا ہو گئے۔ اسی طرح مختلف ادوار میں نئے حیوانات پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہے ہیں۔ ۴ آج سے دو ارب سال پیش تر سمندر کے کنارے پایاب پانی میں زندگی کا آغاز ہوا۔ ۶۰ کروڑ سال قبل یک خلوی جانور پیدا ہوئے، پھر ۳ کروڑ سال بعد اسفنج اور سہ خلوی جانور پیدا

ہوئے۔ ۴۵/کروڑ سال قبل پتوں کے بغیر پودے ظاہر ہوئے۔ اسی دور میں فقاری (ریڑھ کی ہڈی والے) جانور پیدا ہوئے۔ ۴۰/کروڑ سال قبل مچھلیوں اور کنکھجوروں کی نمود ہوئی۔ ۳۰/کروڑ سال قبل بڑے بڑے دلدلی جانور پیدا ہوئے۔ یہ عظیم الجثہ جانور ۴ فٹ لمبے اور ۳۵ ٹن تک وزنی تھے۔ ۱۳/کروڑ سال بعد یا آج سے ۱۷/کروڑ سال پہلے بے دم بوزنہ (Ape) سیدھا ہوکر چلنے لگا (یعنی وہ بندر جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کا جداعلیٰ ہے)۔ اس سے ۳۰/کروڑ سال بعد یا آج سے ۷۰/لاکھ سال پہلے اس بے دم بوزنے کی ایک قسم 'تیھکن تھروپس' سے پہلی انسانی نسل وجود میں آئی۔ مزید ۵۰/لاکھ سال بعد یا آج سے ۲۰/لاکھ سال پہلے اولین باشعور انسانی نسل پیدا ہوئی، جس نے پتھر کا ہتھیار اٹھایا۔ مزید ۲/لاکھ سال بعد اس میں ذہنی ارتقاء ہوا اور انسانی نسل نے غاروں میں رہنا شروع کیا۔۵ے

ڈارون نے اپنی پہلی کتاب 'اصل الانواع' ۱۸۵۹ء میں لکھی، پھر 'اصل الانسان' اور 'تسلسل انسانی' لکھ کر اپنے نظریہ کی مزید تائید کی۔ اس نے اس نظریہ کو مندرجہ ذیل چار اصولوں پر استوار کیا ہے: (۱) تنازع للبقاء (۲) اصول طبعی انتخاب (۳) ماحول سے ہم آہنگی (۴) قانونِ وراثت۔ ڈارون کے یہ خیالات بعض مخصوص نظریاتی اور سیاسی حلقوں کو بہت زیادہ پسند آئے۔ انھوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی، جس کے نتیجے میں یہ خیالات بہت زیادہ مقبول ہوگئے۔ ان کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ یہ رہی کہ اس زمانے میں علم کی سطح اتنی بلند نہیں تھی کہ ڈارون کے مزعومات میں پوشیدہ جھوٹ کو سب کے سامنے عیاں کیا جاسکتا۔ جب ڈارون نے ارتقاء کے حوالے سے اپنے مفروضات پیش کیے تو اس وقت جینیات (Genetics)، خرد حیاتیات (Microbiology) اور حیاتی کیمیا (Biochemistry) جیسے مضامین موجود ہی نہیں تھے۔ اگر یہ مضامین ڈارون کے زمانے میں ہوتے تو اس کو بھی بہ آسانی پتہ چل جاتا کہ اس کا نظریہ غیر سائنسی ہے، کیوں کہ کسی نوع کا تعین کرنے والی ساری معلومات پہلے ہی سے اس کے جین (Genes) میں موجود ہوتی ہیں۔ فطری انتخاب کے ذریعے، جین میں تبدیلی کرکے کسی ایک نوع سے دوسری نوع پیدا کرنا قطعاً ناممکن اور حقیقت سے بعید ہے۔

جس وقت ڈارون کی مذکورہ بالا کتاب 'اصل الانواع' اپنی شہرت کے عروج پر تھی، اسی زمانے میں آسٹریا کے ایک ماہرِ نباتات گریگر مینڈل نے ۱۸۶۵ء میں توارث کے قوانین دریافت کیے۔ اگرچہ ان مطالعات کو انیسویں صدی کے اختتام تک کوئی خاص شہرت حاصل نہیں ہوسکی، مگر ۱۹۰۰ء کے عشرے میں حیاتیات کی نئی شاخ 'جینیات' متعارف ہوئی اور مینڈل کی دریافت بہت زیادہ اہمیت اختیار کرگئی۔ کچھ عرصے بعد جین کی ساخت اور کروموسومز (Chromosomes) بھی دریافت ہوگئے۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ڈی این اے (DNA) کا سالمہ دریافت ہوا، جس میں ساری جینیاتی معلومات پوشیدہ ہوتی ہیں۔ یہیں سے نظریۂ ارتقاء میں ایک شدید بحران کا آغاز ہوا، کیونکہ اتنے مختصر سے ڈی این اے میں بے اندازہ معلومات کا ذخیرہ کسی بھی طرح سے 'اتفاقی واقعات' کی مدد سے واضح نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان تمام سائنسی کاوشوں سے ہٹ کر، تلاشِ بسیار کے باوجود، جان داروں کی ایسی کسی درمیانی شکل کا سراغ نہیں مل سکا جسے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی روشنی میں لازماً موجود ہونا چاہیے تھا۔

اصولاً تو ان دریافتوں کی بنیاد پر ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو علمی میدان میں رد کردیا جانا چاہیے تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ بعض مخصوص حلقوں نے اس پر نظرِ ثانی، اس کے احیاء اور اسے سائنسی پلیٹ فارم پر بلند مقام دینے کا اصرار اور دباؤ جاری رکھا۔ ان کوششوں کا مقصد اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب ہم نظریۂ ارتقاء کے پیدا کردہ نظریاتی رجحانات کو محسوس کریں، نہ کہ اس کے سائنسی پہلوؤں کا جائزہ لیں۔ نظریۂ ارتقاء پر یقین کو قائم ودائم رکھنے کی تمام کوششوں کے باوجود یہ حلقے جلد ہی ایک بند گلی میں پہنچ گئے۔ اب انھوں نے ایک نیا ماڈل پیش کردیا، جس کا نام 'جدید ڈارونزم' (Neo-Darwinism) رکھا گیا۔

جدید ڈارونزم کے مطابق انواع کا ارتقائی تغیرات (Mulalions) اور ان کے جین (Genes) میں معمولی تبدیلیوں سے ہوا۔ مزید یہ کہ صرف وہی انواع باقی بچیں جو فطری انتخاب کے نظام کے تحت موزوں ترین (Fillesl) تھیں۔ ۶ مگر جب یہ ثابت کیا گیا کہ جدید ڈارونزم کے مجوزہ نظامات درست نہیں اور یہ کہ نئی انواع کی تشکیل کے لیے معمولی جینیاتی تبدیلیاں کافی نہیں ہیں تو ارتقاء کے حمایتی ایک بار پھر نئے ماڈلس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ۷

جدید ڈارونزم کے حامیوں نے اب کی بار ایک نیا ماڈل پیش کیا، جسے 'نشان زد توازن' (Punctualed Equilibrium) کہا جاتا ہے۔ اس ماڈل کے مطابق جان دار کوئی 'درمیانی شکل' اختیار کیے بغیر اچانک دوسری انواع میں ارتقا پذیر ہو گئے۔ اس کے لیے انھوں نے کوئی ٹھوس ثبوت یا دلیل پیش نہیں کی۔ اگر اس تبدیلی کو قدرتی طاقت کے زمرے میں لایا جائے تو یہ تبدیلی خالقِ کائنات کے ارادے سے ہوئی ہوگی، لیکن نشان زد توازن کی تھیوری پیش کرنے والے اس پہلو کو قبول نہیں کرتے، اس کے بجائے وہ حقیقت کو ناقابلِ فہم دعووں میں چھپانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ ۸؎ یہ دعوے جینیات، حیاتی طبیعیات اور حیاتی کیمیا کے طے شدہ قواعد وضوابط سے مکمل طور پر متصادم ہیں۔ جدید ڈارونزم کے علم بردار کچھ ارتقاء پرست ماہرینِ رکازیات معدومیات (Paleonlologisls) نے اس نظریے (نشان زد توازن) کو اپنا لیا، جو اپنی ذات میں جدید ڈارونزم سے بھی زیادہ عجیب وغریب اور ناقابلِ فہم ہے۔

نشان زد توازن کا بنیادی مقصد رکازی ریکارڈ میں خالی جگہوں کی موجودگی کی وضاحت فراہم کرنا ہے، تاکہ لوگوں کو بتایا جاسکے کہ انسان کا ارتقاء کیسے ہوا؟ اس کے بارے میں جو ماڈل انھوں نے پیش کیا وہ عقل کو قائل نہ کرسکا۔ ان کا یہ کہنا کہ رینگنے والے جانور کا انڈا ٹوٹا اور اس میں سے پرندہ برآمد ہوا، بہ مشکل ہی پورے مسئلے پر دلالت کرتا ہے۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مطابق انواع کو ایک سے دوسری شکل میں منتقل کرنے کے لیے زبردست قسم کا جینیاتی تغیر درکار ہوتا ہے۔ ۹؎ جس کے بغیر کوئی جینیاتی تغیر بھی، خواہ وہ کسی بھی پیمانے کا ہو، جینیاتی معلومات کو بہتر بناتا ہوا یا ان میں اضافہ کرتا ہوا نہیں پایا جاتا۔ تغیرات (تبدیلیوں) سے تو جینیاتی معلومات اُلٹ پُلٹ ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ 'مجموعی تغیرات' (Gross Mutations) کا تصور نشان زد توازن کے ذریعے پیش کیا گیا ہے، جو صرف جینیاتی معلومات میں کمی اور خامی کا باعث ہی بن سکتے ہیں۔ ۱۰؎ زندگی کی ابتداء کیسے ہوئی؟ معلول تو موجود ہے، لیکن عِلت کی کڑی نہیں ملتی، گویا اس نظریہ کی بنیاد ہی غیر سائنسی ہے۔ اس سلسلہ میں غلام پرویز احمد لکھتے ہیں:

''یہ تو ڈارون نے کہا تھا، لیکن خود ہمارے زمانے کا ماہرِ ارتقاء Simpson

زندگی کی ابتداء اور سلسلۂ علت و معلول کی اولین کڑی کے متعلق لکھتا ہے کہ زندگی کی ابتداء کیسے ہوگئی؟ نہایت دیانت داری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں کچھ علم نہیں۔..... یہ معمہ سائنس کے انکشافات کی دست رس سے باہر ہے اور شاید انسان کے حیطۂ ادراک سے بھی باہر۔..... اور میرا خیال ہے کہ ذہنِ انسانی اس راز کو کبھی پا نہیں سکے گا۔ ہم اگر چاہیں تو اپنے طریقہ پر اس علّتِ اولیٰ (اللہ تعالیٰ) کے حضور اپنے سر جھکا سکتے ہیں، لیکن اسے اپنے ادراک کے دائرے میں کبھی نہیں لا سکتے'۔ ۱۱؎

ارتقاء کا کوئی ایک چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی آج تک انسان کے مشاہدہ میں نہیں آیا، یعنی کوئی چڑیا ارتقاء کر کے مرغا بن گئی ہو، یا گدھا ارتقاء کر کے گھوڑا بن گیا ہو، یا لوگوں نے کسی چیمپینزی یا گوریلا بندر یا بن مانس کو انسان بنتے دیکھا ہو۔ اسی طرح بعض کم تر درجے کے بحری جانور، جو ابتدائے زمانہ میں پائے جاتے تھے، آج بھی اسی شکل میں موجود اور اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے بہت سے مفکرین اس نظریہ ارتقاء کے منکر ہیں۔ وہ اس کے بجائے 'خصوصی تخلیق' (Special Creation) کے قائل ہیں، یعنی ہر نوعِ زندگی کی تخلیق بالکل الگ طور پر ہوئی ہے۔ ۱۲؎

مفروضۂ ارتقاء کے حامیوں کے خیال میں سلسلۂ ارتقاء کے موجودہ دور میں نظر نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ یہ عمل بہت آہستگی سے لاکھوں کروڑوں سالوں میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ دلیل بھی مہمل ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۶۵ء میں آئس لینڈ کے قریب زلزلے اور لاوا پھٹنے کے عمل سے ایک نیا جزیرہ سرٹسے (Surtsey) نمودار ہوا اور محض سال بھر کے اندر اُس میں ہزاروں اقسام کے کیڑے مکوڑے، حشرات الارض اور پودے پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ یہ بات ابھی تک (کسی ارتقاء پسند کی) سمجھ میں نہیں آ سکی کہ وہ سب وہاں کیسے اور کہاں سے آئے؟!

ارتقاء پرست قدیم اور جدید کے درمیان ایک مضبوط قسم کا تعلق جوڑنا چاہتے ہیں، جس کے ذریعے وہ اپنے پیش کردہ تصور کو دنیا کے سامنے دلیل کے طور پر پیش کر سکیں۔ اس کے ذریعے وہ مخلوقات کو ارتقاء کے مختلف مرحلوں سے گزارتے ہوئے انسان تک پہنچا دیتے ہیں۔

قدرت نے ان گنت جانوروں کی تخلیق کی ہے۔ وہ بڑے حیرت انگیز کام انجام دیتے ہیں۔ مثلاً مکڑی بڑی باریکی سے اپنا گھر تعمیر کرتی ہے، شہد کی مکھیاں بڑی دقیق کاریگری سے چھتے تیار کرتی ہیں، اودبلاؤ کے تعمیر شدہ بند انجینیرنگ کے عمدہ حساب کتاب کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ دیمک کے اندھے کیڑے کئی منزلہ عمارت تیار کرلیتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے جان دار انہی مہارتوں کے ذریعے اللہ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اللہ ہی کے احکام بجالاتا ہے:

مَّامِن دَآبَّةٍ اِلاَّهُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا۔ کوئی زمین پر چلنے والا ایسا نہیں جس کی پیشانی اس کے قبضے میں نہ ہو۔ (ہود:۵۶)

نظریۂ ارتقاء سے لاتعداد سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب جانوروں کو کس نے ارتقائی عمل سے گزارا؟ اوران کا ارتقاء کس مخلوق سے عمل میں آیا؟ کیمیائی جنگ کے سلسلے میں تو بوزنہ (Ape) اِس حقیر دیمک سے بہت پیچھے رہ جانے والی قدیم مخلوق ہے، پھر اسے بچ رہنے والی مخلوقات میں انسان سے قریب ترین مخلوق کیونکر کہا جاسکتا ہے؟!!

ارتقائی سلسلہ کی متعدد درمیانی کڑیاں غائب ہیں، مثلاً جوڑوں والے اور بغیر جوڑوں والے جانوروں کی درمیانی کڑی موجود نہیں۔ فقاری (ریڑھ کی ہڈی والے) اور غیر فقاری جانوروں کی درمیانی کڑی بھی مفقود ہے۔ مچھلیوں اور وہ حیوانات جو خشکی اور پانی کے جانور کہلاتے ہیں، ان کے درمیان کی کڑی بھی غیر موجود ہے۔ اسی طرح رینگنے والے جانوروں اور پرندوں اور رینگنے والے ممالیہ جانوروں کی درمیانی کڑیاں بھی غائب ہیں۔ اس نظریہ کی یہ ایسی دشواری ہے جو سو سال سے زیرِ بحث چلی آرہی ہے۔ بعض حضرات اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ درمیانی کڑی کا کام جب پورا ہوجاتا ہے تو وہ از خود غائب ہوجاتی ہے۔ اس جواب میں جتنا وزن یا معقولیت ہے اس کا آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں۔

Earth Sciences نامی جریدے کے مدیر رچرڈ مونسٹارسکی جان دار انواع کے اچانک ظاہر ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نصف ارب سال پہلے نمایاں طور پر پیچیدہ ساخت والے جانور، جیسا کہ ہم

آج دیکھتے ہیں، اچانک ظاہر ہوگئے۔ یہ موقع یعنی زمین پر کیمبری عہد کا آغاز (تقریباً ۵۵ کروڑ سال پہلے) ایک ایسے ارتقائی دھماکے کی مانند ہے جس نے زمین کے سمندروں کو شروع شروع میں پیچیدہ جان داروں سے بھر دیا تھا۔ جان داروں کے وسیع فائلم (Phyla)، جن کا آج ہم مشاہدہ کرتے ہیں، ابتدائی کیمبری عہد میں بھی موجود تھے اور ایک دوسرے سے اتنے ہی جداگانہ اور ممتاز تھے، جتنے کہ آج ہیں''۔ ۱۳؎

زمین اچانک ہزاروں مختلف جانوروں کی انواع سے کس طرح لب ریز ہوگئی تھی؟ جب اس سوال کا جواب نہیں مل سکا تو ارتقائی ماہرین کیمبری عہد سے قبل ۲ کروڑ سال پر محیط ایک تخیلاتی عہد پیش کرنے لگے، جس کا مقصد یہ بتانا تھا کہ کس طرح سے زندگی ارتقاء پذیر ہوئی اور یہ کہ 'کوئی نامعلوم واقعہ پیش آیا ہوگیا'۔ یہ عہد (Period) 'ارتقائی خلا' (Evolutionary Gap) کہلاتا ہے۔ اس دوران میں حقیقتاً کیا ہوا تھا؟ اس بارے میں اب تک کوئی شہادت نہیں مل سکی ہے اور یہ تصور بھی مبہم اور غیر واضح ہے۔

۱۹۸۴ء میں جنوب مغربی چین میں چنگ ژیانگ کے مقام پر وسطی ینان کی سطح مرتفع سے متعدد پیچیدہ غیر فقاری جان داروں (Invertebrates) کے رکازات برآمد ہوئے۔ ان میں ٹرائلو بائٹس (Trilobites) بھی تھے، جو اگرچہ آج معدوم ہو چکے ہیں، لیکن وہ اپنی ساخت کی پیچیدگی کے معاملے میں کسی بھی طرح سے جدید غیر فقاریوں سے کم نہیں تھے۔ سویڈن کے ارتقائی ماہر معدومیات (Evolutionary Paleontologist) اسٹیفن بنگسٹن نے اس کیفیت کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

''اگر زندگی کی تاریخ میں کوئی واقعہ، انسانی تخلیق کی دیومالا سے مماثلت رکھتا ہے تو وہ سمندری حیات کی یہی اچانک تنوع پذیری (Diversification) ہے جب کثیر خلوی جان دار، ماحولیات (Ecology) اور ارتقاء میں مرکزی اداکار کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ڈارون سے اختلاف کرتے ہوئے اس واقعے نے اب تک ہمیں پریشان اور شرمندہ کر رکھا ہے۔ ان پیچیدہ جان داروں کا

اچانک اور آباء واجداد کے بغیر وجود میں آجانا واقعتاً آج کے ارتقاء پرستوں کے لیے اتنی ہی پریشانی اور شرمندگی کا باعث ہے، جتنا ڈیڑھ سو سال پہلے ڈارون کے لیے تھا''۔ ۱۴؎

رکازی ریکارڈ (Paleontology) کی شہادتوں میں یہ امر بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ جان دار کے اجسام کسی ابتدائی شکل سے ترقی یافتہ حالت میں ارتقاء پذیر نہیں ہوئے، بلکہ اچانک ہی ایک مکمل حالت کے ساتھ زمین پر نمودار ہوگئے۔ درمیانی (انتقالی) شکلوں کی عدم موجودگی صرف کیمبری عہد تک ہی محدود نہیں، فقاریوں (ریڑھ کی ہڈی والے جان داروں) کے مبینہ تدریجی ارتقاء کے ثبوت میں بھی آج تک اس طرح کی کوئی درمیانی شکل دریافت نہیں کی جاسکی۔ چاہے وہ مچھلی ہو یا جل تھلیے (Amphibians)، ہوّام ہوں یا پرندے یا ممالیہ، رکازی ریکارڈ کے اعتبار سے بھی ہر جان دار نوع کا اچانک اپنی موجودہ، پیچیدہ اور مکمل حالت میں آنا ہی ثابت ہے۔ بہ الفاظِ دیگر جان دار انواع، ارتقاء کے ذریعے وجود میں نہیں آئیں، بلکہ انھیں تخلیق کیا گیا ہے۔ ۱۵؎

مفروضۂ ارتقاء کے حامیوں کا ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ تمام مخلوقات 'فطری انتخاب' یا 'بقائے اَصلح' (Survival of the Fittest) کے قانون کے تابع ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ڈائنوسار (Dinosaur) کی مثال دیتے ہیں، جس کی نسل ہزاروں سال پہلے کرۂ ارضی سے کلیتاً معدوم ہوگئی تھی۔ لیکن اِس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ روئے زمین پر موجود ۱۵ر لاکھ اقسام کی زندہ مخلوقات کے مقابلے میں معدوم مخلوقات کی تعداد ۱۰۰ر سے زیادہ نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ بہت سی مخلوقات اپنے ماحول میں پائے جانے والے مشکل ترین حالات کے باوجود لاکھوں سال سے زندہ ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں تین اہم مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں: اندھی مچھلی، اندھا سانپ، آسٹریلوی خار پشت۔ ان جان داروں میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں دیکھی گئی جو انسان کو ڈاروینی ارتقاء کو قبول کرنے کے لیے مجبور کرے۔ اندھی مچھلی کی مختلف اقسام ایک دوسرے کو اپنی صلاحیت کے حساب سے ختم کرسکتی تھیں، مگر مچھلی کی یہ تینوں اقسام لاکھوں سال سے ایک ساتھ پُرامن طور پر زندگی بسر کررہی ہیں۔

ڈارون نے ارتقاء کے جو اصول بتائے ہیں وہ مشاہدات کی رو سے صحیح ثابت نہیں ہوتے، مثلاً قانونِ وراثت کے متعلق وہ کہتا ہے کہ لوگ کچھ عرصہ تک کتوں کی دم کاٹتے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتے بے دم پیدا ہونے لگے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ عرب اور عبرانی لوگ عرصۂ دراز سے ختنہ کرواتے چلے آ رہے ہیں، لیکن آج تک کوئی مختون بچہ پیدا نہیں ہوا۔ ماحول سے ہم آہنگی پر اعتراض یہ ہے کہ انسان کے پستانوں کا بدنما داغ آج تک کیوں باقی ہے، جس کی کسی دور میں کبھی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ نیز انسان سے کم تر درجہ کے جانوروں (نروں) میں یہ داغ موجود نہیں ہے۔ رکاز کی دریافت بھی نظریۂ ارتقاء کو باطل قرار دیتی ہے۔ رکاز سے مراد انسانی کھوپڑیاں یا جانوروں کے وہ ادھورے ڈھانچے، پنجر اور ہڈیاں ہیں جو زمین میں مدفون پائی جاتی ہیں۔ نظریۂ ارتقاء کی رو سے کم تر درجہ کے جانوروں کی ہڈیاں زمین کے زیریں حصہ میں اور اعلیٰ انسان کے رکاز زمین کے بالائی حصہ میں پائے جانے چاہئیں، جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور رکاز کی دریافت اس نظریہ کی پرزور تردید کرتی ہے۔

نظریہ ارتقاء کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ زندگی ایک خلیے سے شروع ہوئی، جو زمین کے ابتدائی ماحول میں اتفاقاً بن گیا تھا۔ آج، جب کہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں، خلیہ کئی پہلوؤں سے ہمارے لیے پر اسرار اور حیرت کا باعث ہے۔ زمین کا ابتدائی ماحول تو بہت دور کی بات ہے، خلیے کی ترکیب اور کام کرنے کا طریقہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ اسے جدید ترین آلات سے لیس موجودہ دور کی تجربہ گاہوں میں بھی 'مصنوعی طور پر' تیار نہیں کیا جا سکا۔ اس کی ساخت میں اینٹوں کا درجہ رکھنے والے امائنو ایسڈز استعمال کرتے ہوئے آج تک خلیے کا ایک جزو (Organelle) بھی تیار نہیں کیا جا سکا (مثلاً مائٹوکونڈریا یا رائبوسوم وغیرہ)۔ ارتقائی اتفاقات کے تحت کسی اولین خلیے کا از خود وجود میں آ جانا اتنا ہی تصوراتی ہے جتنا ایک سینگ والا اُڑن گھوڑا (یونی کورن)۔ بات صرف خلیے تک ہی محدود نہیں، بلکہ قدرتی حالات کے تحت ہزاروں سالمات سے مل کر تشکیل پانے والا پروٹین (Protein) بنانا بھی ناممکن ہے۔ پروٹین وہ قوی الجثّہ سالمات ہوتے ہیں جو امائنو ایسڈز کی خاص تعداد کے مخصوص ترتیب میں ملنے پر بنتے ہیں۔ یہی سالمات خلیے کے وجود کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اب تک دریافت ہونے والا

چھوٹے سے چھوٹا پروٹین بھی پچاس (۵۰) امائنوایسڈز پر مشتمل ہے، مگر بعض پروٹین سینکڑوں اور ہزاروں امائنوایسڈز کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ امکان کے سادہ ترین حساب کے ذریعے ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ پروٹین کی کارآمد ساخت کسی بھی طرح سے اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوسکتی۔ اگر اس میں کوئی تبدیلی پیدا ہوجائے، یعنی ان میں غیر معمولی اضافہ یا کمی ہوجائے تو عین ممکن ہے کہ اس سے انسانی پیدائش میں تباہ کن نتائج ظاہر ہوں۔ نظامِ قدرت میں کل ۲۰ قسم کے امائنوایسڈز پائے جاتے ہیں۔ انہی کے مختلف تناسبوں کے ردّوبدل سے مختلف پروٹین بنتے ہیں۔ اب اگر ہم اوسط جسامت والا کوئی پروٹینی سالمہ فرض کرلیں جو ۲۸۸ امائنوایسڈز پر مشتمل ہو، تو یہ امائنوایسڈز 10^{300} مختلف طریقوں کے ذریعے مل کر ۲۸۸ یونٹوں (امائنوایسڈز) والی پروٹینی زنجیر بناسکتے ہیں۔ (10^{300} کا مطلب ہے ۱ کے بعد ۳۰۰ صفر!) ان تمام ممکنہ زنجیروں میں سے صرف ایک زنجیر ایسی ہوگئی جو ہمارے مطلوبہ خواص کا حامل پروٹین بنائے گی۔ اسے ریاضی کی زبان میں اس طرح کہا جائے گا کہ مذکورہ بالا پروٹین حاصل ہونے کا امکان 10^{300} میں سے صرف ایک ہے۔ ۱۶ امائنوایسڈز کی باقی زنجیریں یا تو زندگی کے لیے بیکار ہوں گی یا پھر نقصان دہ۔ مطلوبہ خواص کا حامل مفید پروٹین 'اتفاق' سے حاصل ہونے کا یہ امکان اس قدر کم ہے کہ اسے تقریباً ناممکن سمجھا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ ۲۸۸ امائنوایسڈز والے پروٹین کی مثال خاصی کم تر درجے کی ہے، ورنہ بہت سے بڑے پروٹین ہزاروں امائنوایسڈز کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ جب ہم ان پر امکان کے اسی حساب کتاب کا اطلاق کرتے ہیں تو 'ناممکن' جیسا لفظ بھی حقیر دکھائی دینے لگتا ہے۔

ترکی میں ارتقاء کے مشہور اور مستند ترین ماہر پروفیسر ڈاکٹر علی ویمر سوئے اپنی کتاب 'موروثیت اور ارتقائ' (Kalitim ve Evrim) میں سائٹوکروم سی (Cytochrome-C) نامی اہم خامرے کی اتفاقیہ تشکیل پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سائٹوکروم سی سلسلے کی (اتفاقیہ) تشکیل کا امکان صفر کے برابر ہے۔ یعنی اگر زندگی کے لیے کسی مخصوص (سالماتی) سلسلے کی ضرورت ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس کے بننے کا واقعہ پوری کائنات (کی مجموعی تاریخ) میں صرف ایک

مرتبہ ہی ہوا ہوگا۔ بہ صورتِ دیگر کسی ایک مابعدالطبیعیاتی قوت نے اسے تخلیق کیا ہوگا، جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخرالذکر کو تسلیم کرنا سائنسی مقاصد کے اعتبار سے موزوں نہیں، لہٰذا ہمیں پہلا مفروضہ ہی ماننا پڑے گا''۔ ۱۷؎

ان سطور کے بعد ڈاکٹر ویمر سوئے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مذکورہ امکان، جو صرف اس وجہ سے قبول کیا جاتا ہے کہ یہ سائنس کے مقاصد کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے، غیر حقیقت پسندانہ ہے:

''سائٹوکروم سی بنانے والا امائنوایسڈز کا خاص الخاص سلسلہ (اتفاقاً) وجود میں آنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ کسی بندر کا ٹائپ رائٹر استعمال کرتے ہوئے مکمل انسانی تاریخ لکھنا۔ اس پر یہ بھی مان لینا کہ بندر ٹائپ رائٹر کی کلیدوں (Keys) کو کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر دبا رہا ہے''۔ ۱۸؎

اگر ارتقائی تصور کو تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے تو سائنسی اصولوں پر اس بات کا پورا اترنا ضروری ہے کہ زندگی واقعی کسی اتفاق کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی تھی، جیسا کہ ارتقاء پرستوں کا دعویٰ ہے۔ ایسی صورت میں 'اتفاق سے' بننے والے، دائیں اور بائیں ہاتھ والے امائنوایسڈز کو بھی یکساں تعداد میں ہونا چاہیے تھا۔ برٹانیکا سائنس انسائیکلوپیڈیا کے مصنفین، جو ارتقاء کے زبردست حامی ہیں، بتاتے ہیں کہ زمین پر پائے جانے والے تمام جان داروں اور پروٹین جیسے پیچیدہ پولیمرز (Polymers) کی ساخت میں اینٹوں کا درجہ رکھنے والے امائنوایسڈز صرف اور صرف بائیں ہاتھ والے ہیں۔ یہیں پر وہ یہ اضافہ بھی کرتے ہیں کہ اس صورت حال کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دس لاکھ مرتبہ سکّہ اچھالا جائے اور ہر مرتبہ اس کا صرف ایک ہی رخ بار بار اوپر آئے۔ اسی انسائیکلوپیڈیا میں وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سالمات کے دائیں یا بائیں ہاتھ والے ہونے کو سمجھنا ناممکن ہے۔ ۱۹؎

تحقیق سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اگر امائنوایسڈز آزادانہ طور پر آپس میں ملاپ کرنے لگیں، یعنی انھیں پابند نہ کیا جائے تو ان میں سے ۵۰٪ فیصد پیپٹائڈ بانڈ (Peptide Bond) بنائیں گے، جب کہ باقی ۵۰٪ فی صد مختلف اقسام کے بانڈ تشکیل دیں گے، جو پروٹینز

میں موجود نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ درست طریقے پر کام کرنے کے لیے، پروٹین بنانے والے ہر امائنوایسڈ کو دوسرے امائنوایسڈز کے ساتھ (جو یقیناً بائیں ہاتھ والے ہوں گے) پیپٹائڈ بند ہی بنانا پڑے گا۔ ایسا کوئی نظام موجود نہیں ہے جو دائیں ہاتھ والے امائنوایسڈز کو منتخب یا مسترد کرے اور انفرادی طور پر اس امر کی ضمانت فراہم کرے کہ ہر امائنوایسڈ دوسروں کے ساتھ صرف پیپٹائڈ بند ہی بنائے گا۔ ان حالات کے تحت ہم یہ جائزہ لیتے ہیں کہ ۵۰۰/امائنوایسڈز والا بالکل درست پروٹین 'اتفاقاً' بننے کے کیا امکانات ہیں۔ ۲۰؎

۱۹۵۳ء میں ڈی این اے (DNA) پر جیمز واٹسن اور فرانسس کرک کی تحقیق نے حیاتیات کے میدان میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ کئی سائنس دانوں نے اپنی توجہ جینیات پر مبذول کی۔ آج برسہا برس کی تحقیق کے بعد سائنس داں ڈی این اے کی ساخت کی خاصی بڑی حد تک نقشہ گری کر چکے ہیں۔ ۲۱؎

عصر حاضر میں ہیومن جینوم پر جیکٹ کے تحت انسانی جین کی نقشہ کشی کی تکمیل انسانی تاریخ میں ایک اہم دریافت ہے، مگر ارتقا پرست اس کو اپنی تحریروں میں مکمل غلط رنگ دے رہے ہیں۔ وہ اس کی غلط تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چیمپینزی اور انسان کے جین میں ۹۸/فی صد مماثلت پائی ہے، حالاں کہ پہلے یہ ہونا چاہیے کہ چمپینزی کا جینوم (Genome) دریافت کر کے اسے مکمل طور پر پیش کرنے اور دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد نتائج سامنے لائے جائیں۔ اس کے بجائے انھوں نے خالص ۳۰ سے ۴۰ بنیادی پروٹینز کے امائنوایسڈز کے درمیان مماثلت دکھا کر دنیا کو گم راہ کرنے کی کوشش کی، جب کہ انسان کے ایک لاکھ امائنوایسڈز کو چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ جو محدود طریقہ استعمال کیا گیا (یعنی ہائبریڈائزیشن کا) اس میں چند عام مماثلتوں والے ایسڈز کو لیا گیا، جو سائنسی طور پر بے بنیاد ہے۔ جن سائنس دانوں نے یہ موازنہ کیا وہ سبلے اور آلکیسٹ ہیں۔ انھوں نے اس موازنہ کو پہلی بار 'سالماتی ارتقائ' نامی جریدے میں شائع کیا۔ ان کی تحقیق کو بعد میں متنازع قرار دیا گیا، اس لیے کہ سارخ نامی سائنس داں نے جب ان کی معلومات کو جانچا اور انھیں سائنسی معیار پر پرکھا تو وہ حیران رہ گیا، کیوں کہ جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا تھا وہ سائنسی معیار سے بالکل مختلف تھا اور نتائج میں بھی مبالغہ آرائی کی گئی تھی۔ ۲۲؎

انسان کا DNA خالصتاً بندر یعنی چمپینزی کے ساتھ ہی نہیں ملتا، بلکہ کیڑے، مچھر، مرغی اور ٹماٹر سے بھی مماثلت رکھتا ہے۔ ان کے اندر پروٹین ہر ایک میں موجود ہیں۔ ایک جینیاتی تجزیے سے یہ انکشاف ہوا کہ نیماٹوڈی کیڑے اور انسان کے ڈی این اے میں ۷۵ فی صد مماثلت پائی جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ پھل مکھی اور انسانی جینز میں ۶۰ فی صد مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف جان داروں کے پروٹین انسان کے پروٹین سے بہت مشابہ ہیں۔ اتنا ہی نہیں، مرغی، مگر مچھ اور انسانی جینوم کے نمونوں کو انتہائی قریب پایا گیا۔ ۲۳؎

ڈاکٹر کرسچین شوابے (محقق حیاتی کیمیا، میڈیکل فیکلٹی، ساؤتھ کیرولینا یونی ورسٹی) ایک ارتقاء پرست سائنس داں ہیں، جنھوں نے سالموں میں ارتقاء کے شواہد تلاش کرنے کے لیے کئی برس صرف کیے ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر انسولین اور ریلیکسن ٹائپ پروٹینز (Relaxin-type Proteins) پر تحقیق کی ہے اور مختلف جان داروں کے درمیان ارتقائی رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم انھیں کئی بار اعتراف کرنا پڑا کہ وہ اپنی تحقیق کے دوران کبھی ارتقاء کے شواہد حاصل نہیں کر سکے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''ارتقائی تعلقات کو دریافت کرنے کے لیے، سالماتی ارتقاء کو علم رکازت سے بہتر طریقہ سمجھنا چاہیے۔ بہ حیثیت ماہرِ سالمیات میں فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ بہت سے جان داروں کے ایک ہی جین سے پیدا ہونے کا تصور حقائق کو خلط ملط کرنے کے مترادف ہے''۔ ۲۴؎

سالماتی حیاتیات میں ہونے والی نئی دریافتوں کی بنیاد پر ایک ممتاز حیاتی کیمیا داں پروفیسر مائیکل ڈینٹن نے یہ خیال ظاہر کیا ہے:

> ''ہر طبقہ سالماتی سطح پر منفرد، الگ تھلگ، لامحدود، غیر متحرک اور بغیر کسی درمیانی ثالث کے پیدا ہوتا ہے۔ جیوشم کی طرح سالم بھی کسی متوسط طریقۂ کار کو کام میں لانے میں ناکام ہوا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ارتقاء پرستوں نے دن دوگنی رات چوگنی کوشش کی ہے۔ سالماتی سطح پر نہ کوئی جان دار ارتقاء پزیر ہوا ہے اور نہ کسی دوسرے جان دار سے ترقی کرکے وجود

میں آیا ہے۔ اس لیے اس میں شک نہیں کہ اگر سالماتی شواہد ایک صدی پہلے مہیا ہوتے تو کوئی بھی ارتقاء کو قبول نہ کرتا''۔ ۲۵؎

یہ حقیقت سائنسی طور پر عیاں ہوگئی ہے کہ تمام جان دار سالماتی طور پر ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے کہ ہر جان دار لگ بھگ ایک ہی قسم کی غذا استعمال کرتا ہے۔ ان سب کا استحالہ (Melabolism) اور جینیاتی بناوٹیں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے سے علٰیحدہ ہیں، مگر یکساں مادے سے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ کسی غیر شعوری اور غیر منصوبہ بند سلسلۂ عوامل کا نتیجہ نہیں، بلکہ خالقِ کائنات کی تخلیق کا نتیجہ ہے۔

ارتقاء کے ماننے والوں کا دعویٰ ہے کہ ارتقاء کا تبدّل جینیاتی نظام میں تبدیلی کے ذریعے عمل میں آیا ہے، جب کہ یہ دعویٰ حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ حیاتیاتی کیمسٹری کے مطابق جینوم کا تبدّل ہمیشہ تباہی کا باعث ثابت ہوسکتا ہے۔ ملّر (Muller) کے تجربات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تعمیری جینیاتی تبدیلی کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں، جینیاتی تبدیلی ہمیشہ تخریبی ہی ہوتی ہے، جس کا نتیجہ کینسر یا موت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر تبدّل میں ذرا بھی حقیقت ہوتی تو اب تک یہ عجوبہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہوتا۔ ۲۶؎

ارتقاء پسندوں نے تصویروں کے ذریعے عالم انسانیت کو دھوکے میں رکھا ہے۔ اس دھوکے بازی کا موثر انداز میں جواب دینے اور صداقت جانچنے کا اہم ترین ماخذ رکازی ریکارڈ ہے۔ اگر اس ریکارڈ کا غیر جانب دارانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ ارتقاء کی حمایت کے بجائے اس کی تردید کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی ارتقاء پرستوں نے رکازی ریکارڈ کو غلط انداز میں پیش کر کے من پسند وضاحتیں کی ہیں اور عوام کی بھاری اکثریت کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ یہ ریکارڈ ارتقاء کی تائید کرتا ہے۔ ہارورڈ یونی ورسٹی کے ارنسٹ، اے، ہوٹن لکھتے ہیں:

''نرم حصوں کو بحال کرنے کی کوشش کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ ہونٹ، آنکھیں، کان اور ناک کی نوک جیسے حصے اپنے نیچے موجود ہڈی پر کوئی سراغ نہیں چھوڑتے۔ لہٰذا آپ نینڈرتھل نما (Neanderthaloid) جانور کی کھوپڑی پر یکساں سہولت کے ساتھ کسی چمپانزی کے خدوخال یا ایک فلسفی

کے نقش ونگار تشکیل دے سکتے ہیں۔قدیم اقسام کے آدمی کی ایسی مبیّنہ تنظیم نو کی اگر کوئی سائنسی قدر و قیمت ہے تو وہ بے حد معمولی ہے اور ممکنہ طور پر صرف عوام کو گم راہ کرنے کا باعث ہے،لہٰذا تنظیم نو پر بھروسہ نہ کیجیے''۔ ۲۷؎

جھوٹے رکازات بنانے کے لیے کیے گئے 'مطالعات' کو سائنسی تحقیق کے اصولوں پر پرکھنا از حد ضروری ہے۔حقیقت میں ارتقاء کا ثبوت فراہم کرنے والے رکازوں کی عدمِ دستیابی کے بعد، بعض ارتقاء پرست ماہرین نے اپنے 'ذاتی رکازات' بنانے کی کوششیں بھی کر ڈالیں۔ یہ کوششیں، جنھیں انسائیکلو پیڈیا بھی 'ارتقاء کی جعل سازیوں' کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں، اس امر کی واضح شہادت دیتی ہیں کہ نظریۂ ارتقاء ایک ایسا نظریاتی ڈھانچہ اور فلسفہ ہے، جس کا دفاع ارتقائی پرست ہر حال میں کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کی دو اہم اور بدنام ترین جعل سازیاں ذیل میں بیان کی جارہی ہیں:

۱۔ ۱۹۱۲ء میں ایک مشہور ڈاکٹر اور شوقیہ معدومی بشریات داں (Amaleur Paleoanthropologist) چارلس ڈاسن نے دعویٰ کیا کہ اسے پلٹ ڈاؤن، برطانیہ کے مقام سے جبڑے کی ہڈی اور کھوپڑی کے حصے ملے ہیں۔ یہ کھوپڑی اگرچہ انسان نما تھی، لیکن جبڑا نمایاں طور پر بندروں جیسا تھا۔ان نمونہ جات کو 'پلٹ ڈاؤن آدمی' (Piltdown Man) کا نام دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ رکازات پانچ لاکھ سال قدیم ہیں۔ علاوہ ازیں یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ یہ رکازات انسانی ارتقاء کے ضمن میں حتمی ثبوت کا درجہ رکھتے ہیں۔ چالیس (۴۰) سال تک اس 'پلٹ ڈاؤن آدمی' پر متعدد مقالے لکھے گئے، کئی تصاویر بنائی گئیں، وضاحتیں پیش کی گئیں اور اس رکاز کو انسانی ارتقاء کی فیصلہ کن شہادت کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔مگر ۱۹۴۹ء میں جب سائنس دانوں نے ایک بار پھر اس کا تجزیہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ 'رکاز' بڑی سوچی سمجھی جعل سازی تھی اور انسانی کھوپڑی کو گوریلے کی ایک قسم (Orangulan) کے جبڑے کی ہڈی سے ملا کر تیار کیا گیا تھا۔فلورین تاریخ نگاری (Fluorine Dating) کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے ابتداء میں محققین نے دریافت کیا کہ انسانی کھوپڑی صرف چند ہزار سال پرانی تھی اور نگوٹان کے جبڑے کی ہڈی میں دانت مصنوعی طور پر پھنسائے گئے تھے۔ ان رکازات کے

ساتھ ملنے والے 'قدیم' اوزار بھی جعلی تھے، جنھیں دھاتی آلات کے ذریعے یہ شکل دی گئی تھی۔ ۲۸؎

او کلے، وائنز اور کلارک نامی ماہرین کا یہ مطالعہ ۱۹۵۳ء میں مکمل ہوا اور اسی سال عوام کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ حتمی نتائج کے مطابق یہ کھوپڑی صرف ۵۰۰ سال پہلے کے کسی آدمی کی تھی اور نچلے جبڑے کی ہڈی شکار کیے ہوئے اورنگوٹان سے لی گئی تھی، بعدازاں اس کے دانتوں کو قطار کی شکل دے کر جبڑے میں لگایا گیا اور جوڑوں کو باریک ریتی سے گھس کر ایسا بنایا گیا کہ وہ کسی انسان سے مماثل دکھائی دینے لگیں۔ آخر میں ان سارے ٹکڑوں کو 'قدیم' ظاہر کرنے کے لیے پوٹاشیم ڈائی کرومیٹ سے داغ دار کر دیا گیا۔ (یہ دھبے تیزاب میں ڈبوتے ہی غائب ہو گئے)۔ اس تحقیقی ٹیم کا ایک رکن 'لی گروس کلارک' اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔ چناں چہ اس کے الفاظ یہ تھے:

''مصنوعی خراشوں کی شہادتیں فوراً ہی آنکھوں کے سامنے ابھرتی ہیں۔ یہ اتنی واضح تھیں کہ پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی نے اتنے لمبے عرصے تک انھیں محسوس ہی نہ کیا ہو؟''۔ ۲۹؎

۲۔ ۱۹۲۲ء میں امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری کے ڈائریکٹر ہنری فیئر فیلڈ اوسبورن نے اعلان کیا کہ اس نے مغربی نبراسکا میں اسنیک بروک کے قریب سے ڈاڑھ (molar tooth) کا رکاز دریافت کیا ہے، جو پلیوسینی عہد (Pliocene Period) سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دانت مبینہ طور پر انسان اور گوریلوں کی مشترکہ خصوصیات کا حامل دکھائی دیتا تھا۔ ۳۰؎ اس کے بارے میں سائنسی دلائل کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ بعض حلقوں نے کہا کہ یہ دانت 'پیتھیکن تھروپس ایریکٹس' (Pithecanthropus Erectus) سے تعلق رکھتا ہے، جب کہ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ یہ دانت جدید انسانی نسل سے زیادہ قریب ہے۔ مختصراً یہ کہ اس ایک دانت کے رکاز کی بنیاد پر زبردست بحث شروع ہو گئی اور اسی سے 'نبراسکا آدمی' کے تصور نے مقبولیت حاصل کی۔ اسے فوراً ہی 'ہیسپیر وپتھے کس ہیرلڈکوکی' سائنسی نام بھی دے دیا گیا۔ متعدد ماہرین نے اوسبورن کی بھرپور حمایت کی۔ صرف ایک دانت کے سہارے 'نبراسکا آدمی' کا سر اور جسم بنایا گیا، یہاں تک کہ اس کے پورے گھرانے کی تصویر بنا دی گئی۔ پروفیسر گِش (Prof. Gish) نے سائنسی معاشرے کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ قدیم انسان کا ڈھانچہ، جسے 'نبراسکا آدمی'

(Nebraska Man) کہتے ہیں، مکمل طور پر ایک مصنوعی چیز ہے اور پورے ڈھانچے کی بنیاد محض ایک دانت پر ہے۔ ۱۹۲۷ء میں اس کے دوسرے حصے بھی دریافت ہوگئے۔ ان نودریافت حصوں کے مطابق یہ دانت انسان کا تھا نہ کسی گوریلے کا، بلکہ یہ انکشاف ہوا کہ اس دانت کا تعلق معدوم جنگلی سوَروں کی ایک نسل سے تھا، جو امریکہ میں پائی جاتی تھی اور اس کا نام 'پروستھی نوپس' (Prosthennops) تھا۔

حیاتیاتی طور پر بھی اِرتقاء کسی صورت میں ممکن نہیں۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی سائنسی ذرائع کی معاونت سے کوئی شخص اس قابل نہیں ہوسکا کہ ایک 'سسٹران' (Cistron)، جو ایک مخصوص پروٹین کے کوڈ کے لیے DNA (Deoxyribonucleic Acid) کی لمبائی ہوتی ہے، میں تبدیلی لاسکے۔ کسی مخلوق میں کامیاب جینیاتی تبدیلی کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جینز (Genes)، جو نامیاتی تعمیر کے فارمولا کی حامل ہوتی ہیں، ایک انتہائی مخصوص نظام کی حفاظت میں ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا راتوں رات بے ہنگم قسم کی مخلوقات سے بھر جاتی۔ چنانچہ حیاتیاتی طور پر بھی ارتقاء کا عمل ناممکن ٹھہرا۔ نِلسن ہیری برٹ (Nilson Heribert) نے کہا ہے کہ انواعِ حیات ایسی ہیں کہ نہ وہ خود بدل سکتی ہیں اور نہ انہیں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر میکس ویسٹن ہوفر (Prof. Max Westenhofer) نے اپنے مطالعہ کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ مچھلی، پرندے، رینگنے والے جانور اور ممالیہ جانور سب ہمیشہ سے ایک ساتھ موجود رہے ہیں۔۳۱ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ پروفیسر ویزمین (Prof. Weismann) کے ہاں 'جاوا کا آدمی' (Java Man) کا تصور سائنس کا تمسخر اڑانے کے مترادف ہے۔

آخر میں نظریۂ ارتقاء کے متعلق چند مغربی مفکرین کے اقوال بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

مغربی مفکرین نے ارتقاء کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا ہے وہ ارتقاء پرستوں کے لیے بہت بڑا دھچکا ہے۔ ایک اطالوی سائنس داں روظا کا دعویٰ ہے کہ گزشتہ ساٹھ سال کے تجربے نظریۂ ڈارون کو باطل اور سائنسی خیانت قرار دیتے ہیں۔ ۳۲ ان کے علاوہ ڈی وریز، ولاس، فرحوار میفرٹ بھی ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو باطل کہتے ہیں۔ ان کا مکمل یقین ہے کہ ڈارون کی رائے بچوں کی باتوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ۳۳ جب کہ آغا سید کا موقف یہ ہے

کہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء مذہب اور سائنس دونوں لحاظ سے غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مکسلے اور ٹنڈل کہتے ہیں کہ جن اصولوں پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔ ۳۴؎ مابعد جدیدیت کے بہت سے سائنس دانوں نے بھی نظریہ ارتقاء کو ٹھکرا دیا اور سائنس کے لیے اس کو بدنما داغ قرار دیا ہے۔ ان میں خاص کر ڈارون گش، جیریمی رفکن، سی ایچ واڈنگٹن، پائرے پال گریس، پروفیسر گولڈ سمتھ، پروفیسر میکنبھ نے دوٹوک الفاظ میں نظریۂ ارتقاء کو مسترد کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مفروضہ ارتقاء کا کوئی سائنسی ثبوت نہیں ہے اور اس کے حق میں چھپوائی گئی اکثر تصاویر جعلی اور من گھڑت ہیں۔ ۳۵؎

سائنسی تحقیق سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ نظریۂ ارتقاء ایک فاسد عقیدہ اور ایک علمی خیانت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر انسان کا ظہور زمین پر کیسے ہو؟ اس کے لیے وہ سائنسی دلائل بہت کارآمد ثابت ہوں گے جن کو استعمال کر کے سائنس داں کسی بھی چیز کو اس کی اصلی شکل وصورت میں پیدا کرتے ہیں۔ آج تک جو مشینیں بنائی گئیں وہ ازخود پیدا نہیں ہوئیں، بلکہ ان کو بنانے کے لیے سائنس دانوں نے مادّے کا استعمال کیا ہے۔ ان مشینوں میں اگر کوئی تکنیکی خرابی آتی ہے تو ان سے کوئی نئی مشین وجود میں نہیں آتی، بلکہ وہ مکمل تباہ یا ناکارہ ہوجاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسانی کے لیے مٹی کا استعمال کر کے اس کو بہترین وجود بخشا ہے۔ اس نے آدم اور اس کی زوج پیدا کی اور دونوں کے اندر ایسا نظام رکھا ہے کہ اگر ان میں کوئی خرابی پیدا ہوجائے تو معاملہ ان کی ہلاکت تک جا پہنچتا ہے۔ یہی نظام اللہ تعالیٰ نے دوسرے جان داروں کے لیے بھی برپا کیا ہے، جس کے تحت وہ اپنا کام چلاتے اور اپنی نسل بڑھاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ہی کو خالقِ زندگی اور نفخِ روحِ خداوندی کو بطور فجائی ارتقاء عامل تسلیم کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے ایک اور مفروضے کا حل ملے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات ہے تو آدم علیہ السلام کو اللہ کی تخلیق کی حیثیت سے قبول کرنا چاہیے۔ اس کے ذریعے نظریۂ ارتقاء سے پیدا ہونے والے بہت سے کنفیوژن کا ازالہ ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کا جو نقشہ بہت سی قرآنی آیات میں کھینچا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کا وجود مادہ یعنی مٹی سے ہوا ہے۔ اس کے بعد آدم اور اس کی زوج سے بے شمار بچے پیدا ہوئے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

إِنَّ مَثَلَ عِيسىٰ عِندَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ۔
(آل عمران:۵۹)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال آدم (علیہ السلام) کی مثال جیسی ہے کہ اسے مٹی سے بنا کر کہہ دیا کہ ہو جا پس وہ ہو گیا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِينٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ العِظٰمَ فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْماً ثُمَّ أَنشَأْنٰهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخٰلِقِينَ۔ (المومنون:۱۲۔۱۴)

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا ہے، پھر اس کو مضبوط (اور محفوظ) جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا، پھر نطفے کو لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت (پوست) چڑھایا، پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا، تو خدا، جو سب سے بہتر بنانے والا ہے، بڑا بابرکت ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔
(ق:۱۶)

ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

نظامِ باری تعالیٰ اتنا مربوط ہے کہ اس کو اتفاق کہنا ایک تمسخر کے علاوہ کچھ نہیں۔ سو جو لوگ حقیقت کے بجائے گم راہی کا راستہ اختیار کرنے پر بضد ہیں ان کے لیے روشنی فائدہ نہیں دے سکتی۔ وہ اندھیری راتوں اور صحراؤں میں اپنا مسکن کھڑا نہیں کر سکتے۔ زمین اور آسمان میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اتنی زیادہ نمایاں ہیں کہ ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ زمین، آسمان اور ان کے درمیان کی ہر شے کا خالق ہے۔ اسی نے انسان کی بھی تخلیق کی ہے۔ اس کے وجود پر دلالت کرنے والی نشانیاں ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔

حواشی و مراجع

1- Bowde, John. 1963. *Creation or Evolution*, Chippendale, New South Wales, Australia: The Rationalist Association of New South Wales, pp. 13-25, 31-33

2- Darwin, Charles(1859). *On the Origin of Species*, London: John Murray, p. 301, Darwin, Charles(1871). *The Origin of Species*, London: John Murray, p.119-120.

3- Michael Ruse, *Evolutionary Ethics,* A Defence, p.93, in *Biology, Ethics, and the Origins of Life,* ed. Holmes Rolston, Boston: Jones & Bartlett, 1995, III, pp. 89-112.

۴۔ احمد ہاشمیل: اسلام اور نظریۂ ارتقائ، ادارۂ معارف اسلامی کراچی، البدر پبلی کیشنز لاہور، ص ۸۵

۵۔ زرّیں معلومات، مطبوعہ فیروز سنز، ص ۷ تا ۹

6- Charles worth, Deborah and Brian.(2003) *Evolution.* Oxford University Press: 7

7- Hoyle, Fred.(1983) *The Intelligent Universe,* Holt, Rinehard and Winston: 32

8- Gould, Stephen Jay,& Eldredge, Niles (1977). *"Punctuated equilibria: the tempo and mode of evolution reconsidered."* Paleobiology 3 (2):115-151. (p.145)

۹۔ روبینہ نازلی، علم الانسان، پورب اکاڈمی اسلام آباد، ص ۲۰۲

10- Kofahl, Robert E. *Handy Dandy Evolution Refuter,* San Diego: Beta Books, 1977, p. 102.

۱۱۔ غلام احمد پرویز، انسان نے کیا سوچا؟ سٹی پبلیشنگ پوائنٹ، لاہور، ص ۵۵

12- Eldredge, Niles, *The Monkey Business: A Scientist Looks at Creationism,* 1982, p. 65)

13- *Discover,* p.40, 4/93

14- Stephen Jay Gould, *"The Return of the Hopeful Monsters,"* Natural History, vol.86, July-August 1977, p. 28.

15- A.H. Clark, *The New Evolution,* Zoogenesis Williams and Wilkins, Baltimore, 1930, p. 196

16- Ali Demirsoy, *Kalitim ve Evrim* (Inheritance and Evolution), Ankara: Meteksan Yayinlari 1984, pp. 59-62.

17- Ibid, p.39-61 18- ibid, p. 39-61

19- Fabbri Britannica Science Encyclopedia, Vol. 2, No. 22, p.519

20- Reinhard Junker& Siegfried Scherer, *"Entstehung Gesiche Der Lebewesen",* Weyel, 1986, p. 89.

۲۱۔ اس کی مزید تفصیلات جاننے کے لیے ملاحظہ فرمائیے: گلوبل سائنس، شمارہ جولائی ۲۰۰۰ئ،

بعنوان 'جینوم اسپیشل'۔

22- Sarich etal, Cladistics, 1989, 5:3-32

23- New scientist, 15 May 1999 P:28.

24- New Scientist 16 August, 1984, P.19

25- Christian Schwabe *'On the Validity of Molecular Evolution'*, Trends in Biochemical Sciences. V.11, July 1986, p. 280

26- Michael Denton, *Evolution; A Theory in Crisis,* London; Burnett Books 1985 pp.290-291

27- Kevin McKean, *Bilim ve Teknik* (Science and Technology), No. 189, p. 7

28- Harun Yahya, *The Evolution Deceit: The Scientific Collapse of Darwinism and Its Ideological Background,* Ta-Ha Publishers Ltd. 2001, p:70-71

29- Ibid, p.73

30- J.E. Walsh, *Unraveling Piltdown: The Science Fraud of the Century and Its Solution,* New York: Random House, 1996, pp.124,125,279and Francis Hitching, *The Neck of the Giraffe, Where Darwin Went Wrong,* New York: Tichnor&Fields, 1982, pp.178-179,202-214

31- Westenhöfer, Max (October 1926). *"Evidence Opposed to the Darwinian Conceptions of the Origin of Species"*. Journal of the American Medical Association 87 (18): 1494–1495. doi: 10.1001/jama.1926.02680180066026. etrieved 1 October 2012.

۳۲۔ اسلام اور نظریہ ارتقائ، ص ۶۰، تصدق حسین، نظریۂ ارتقا۔ ایک فریب، اسلامک ریسرچ سنٹر پاکستان، لاہور، ص ۷۰-۸۰

۳۳۔ حوالہ سابق، ص ۶۰-۶۱ ۳۴۔ حوالہ سابق، ص ۶۲

۳۵۔ ڈاکٹر طاہر القادری: تخلیقِ کائنات اور جدید سائنس، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ئ، ص ۴۱۰-۴۲۵

☆☆☆